رسائل و مسائل

معلمی کا پیشہ اختیار کر رہا ہوں۔ آپ کی کتاب "احیائے اسلام اور معلم" پڑھ کر حقیقی معلم بننے کے لیے بے تاب ہوں، لیکن ارد گرد اساتذہ کا کردار دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہوں۔ رہنمائی چاہتا ہوں؟

کوئی انسان خامیوں سے پاک نہیں ہو سکتا، نہ سب انسان ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ ہر اجتماعی گروہ میں بہت اچھے لوگ بھی مل جائیں گے، ان سے بہت کم درجے کے بھی۔ آپ چند آدمیوں کو دیکھ کر بحیثیت مجموعی تمام گروہ کے بارہ میں کوئی تاثر قائم کر لیں، کوئی رائے بنا لیں، یا کوئی فتویٰ دے دیں، تو یہ صحیح نہ ہو گا۔ دیکھنا چاہیے کہ بحیثیت مجموعی یہ گروہ کیسا ہے؟ جو افراد مجھے خراب لگتے ہیں وہ صرف معیار مطلوب سے نیچے ہیں اور چند خامیوں کا شکار ہیں، یا پورے بگڑ چکے ہیں۔ ہم سب میں خرابیاں ہیں، ہم کبھی اپنی ۲۴ گھنٹہ کی زندگی سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی اپنے کو الاؤنس دیتے ہیں، استغفار کرتے ہیں، اور اصلاح کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہی ہمیں دوسروں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ مایوس ہرگز نہ ہونا چاہیے، اپنے سے زیادہ الاؤنس دوسروں کو دینا چاہیے، ان کے لیے استغفار کرنا چاہیے، ان کی اصلاح بھی حکمت سے کرنا چاہیے۔

نفس امارہ کو نفسِ لوّامہ کے تابع کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

مسئلہ بہت سیدھا ہے۔ اس کا جواب بھی آسان ہے، عمل بھی آسان۔ انسان خود اسے مشکل بنا لیتا ہے۔ نفسِ لوّامہ، نفسِ امّارہ اور نفسِ مطمئنہ کی اصطلاحات کا چکر چھوڑ دیجیے، قرآن و حدیث کی روشنی میں غور کیجیے۔

انسان کے نفس میں نیکی اور بدی دونوں کے میلانات ہیں۔ یہ میلانات اس آزمایش کے لیے ضروری ہیں، جس کی خاطر وہ زمین پر بھیجا گیا۔ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (تاکہ اللہ آزمائے کہ تم میں سے کون حسن عمل کرتا ہے)۔ اپنے اختیار سے بدی سے رک جائیں اور نیکی کریں، یہی امتحان ہے۔ نیکی اور بدی کے درمیان کشمکش مسلسل اور مستقل ہے۔ یہ موت سے پہلے ختم نہ ہو گی، لیکن اس وقت

امتحان بھی ختم ہو جائے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ بدی کا رجحان ختم ہو جائے یا بالکل مغلوب ہو جائے۔

کسی کو بھی انسان پر یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اس سے زبردستی برائی کرائے۔ اپنا نفس بھی وسوسہ پیدا کرتا ہے، برائی کا خیال ڈالتا ہے۔ شیطان بھی یہی کرتا ہے، انسان بھی، مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۔ انسان خود اپنے اختیار سے بدی کرتا ہے۔ اگر اختیار سے نہیں کرتا، بلکہ مجبور ہے، تو مواخذہ بھی نہیں۔ یہی امارہ بالسوء ہے۔

اس کا علاج بہت آسان ہے۔ اللہ کو یاد رکھنا۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (بے شک اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں)۔ ہر نعمت کو، ہر ملنے والی چیز کو، ہر مصیبت کو اس کی طرف سے دیکھنا۔ ہر سبب کے پیچھے رب کو دیکھنا۔ اس سے ملاقات کو یاد رکھنا، آپ اس نسخہ پر عمل کریں، جتنا کر سکیں۔ یہی نسخہ ہے نفسِ امارہ بالسوء کو قابو میں رکھنے کا، اور کوئی نہیں۔ اس کے بعد بھی کوئی ضمانت نہیں کہ نفس مغلوب ہو گا، گناہ نہ ہوں گے، آپ غافل نہ ہو جائیں گے، کبھی خواہشات کی دلدل میں نہ پھنس جائیں گے۔ اس کا علاج بھی یہی ہے: فوراً اللہ کو یاد کرنا اور استغفار کرنا۔ اس کی یاد کے نور سے سازی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ اللہ آپ کی مدد کرے۔

شرک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے اور یہ کہ یہ ناقابلِ معافی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

بندہ گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کرتا، اپنا نقصان کرتا ہے۔ اگر ساری مخلوق متقی ترین ہو جائے تو اس کی خدائی میں کوئی اضافہ نہ ہو گا۔ اگر سب بدترین گناہ گار بن جائیں تو اس کی خدائی میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ ظلم کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز یا عمل کو وہ مقام دیا جائے جس کا وہ مستحق نہیں۔ شرک کرنے والا اپنے نفس کو غیر اللہ کا عبد بناتا ہے، غیر اللہ کو اللہ کا مقام دیتا ہے۔ اللہ کے عظیم شان و مقام میں کمی کرتا ہے، اس لیے وہ ظلمِ عظیم ہے۔ بندہ پر اللہ کا حق ہے کہ وہ صرف اس کی بندگی کرے۔ یہ ایک لامتناہی حق ہے اور لامتناہی حق کو تلف کرنے کی سزا لامتناہی ہی ہو سکتی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

کیا آپ میری مدد فرما سکیں گے؟ اک بندے کی تلاش کے سلسلے میں، کہ اللہ تعالیٰ، جس کا ہاتھ بن گیا ہو، جس کا پاؤں بن گیا ہو، جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے، تو کیا انگلی رکھ کر کسی مخصوص شخص کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ، ہاں یہ ہے وہ شخص۔ اس کی دوسری توجیہ کیا ہو سکتی ہے۔

ایسے لوگ یقیناً پائے جانے چاہییں، اور پائے جاتے ہیں، جن پر وہ حدیث قدسی صادق آتی ہے کہ، میں ان کا ہاتھ بن جاتا ہوں، پاؤں بن جاتا ہوں۔ لیکن کیوں کہ یہ کوئی دینی منصب نہیں، قربِ الٰہی کا

ایک درجہ اور مقام ہے، اس لیے ایسے آدمیوں کی نشان دہی انگلی رکھ کر کرنا، صرف ظن و تخمین پر مبنی ہو گا۔ یہ نہ مناسب ہے نہ ممکن۔ اس میں بہت فتنوں کے امکانات بھی ہیں۔

حدیث کا مقصد ایسے لوگوں کی نامزدگی کی جستجو کرنا نہیں، خود ویسا بننے کے لیے کوشاں رہنے کی ترغیب دینا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی فکر کرے، اور جو اس مطلوب معیار کے قریب بھلے لوگ نظر آئیں، ان سے دوستی و محبت کا رشتہ استوار کرے۔

کافی دفعہ آپ کی گفتگو اور تحریروں سے استفادہ کیا، اور غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے بہت مفید پایا۔ اسی لیے آپ سے مخاطب ہوں۔ امید ہے شفقت سے متوجہ ہوں گے۔ کیا اقامت دین یا تحریک اسلامی کے کام کے سلسلے میں وقت اور فرصت کے لحاظ سے ناموزوں اور ایمان و تقویٰ کے لحاظ سے متصادم ذریعہ روزگار ترک کرنا درست ہو گا، جبکہ اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ روزگار بھی نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور کم فہمی کا تصور تو نہ ہو گا؟ میں کافی عرصہ سے بے روزگار ہوں۔ کیا اسے اپنے اللہ کی طرف سے عملوں کی ابتلا یا سرزنش جانوں یا تقدیر کا نوشتہ سمجھ کر قبول کر لوں؟ کیا ان معاملات میں انسان کو قدرت حاصل ہے کہ اپنے پلاننگ اور بہتر کام سے انھیں بدل سکے۔

۱۔ فقر و افلاس، انسان کو کفر تک لے جا سکتا ہے۔ اس لیے میری دانست میں جب تک متبادل حلال ذریعہ معاش کا معقول امکان نہ ہو، آپ غلط روزگار ترک نہ کریں، اِلاّ یہ کہ اپنے حالات، استقامت اور امکانات کو دیکھتے ہوئے آپ اپنے اندر ہر قسم کی صورت حال سے نپٹنے کی صلاحیت اور عزیمت پاتے ہوں۔ بعض جیّد علما کا فتویٰ یہی ہے۔

ہاں، جب تک ذریعہ معاش غلط رہے، دل میں اس کی خلش رہے، اس پر ندامت رہے، اس پر استغفار کریں، اور اس کو چھوڑنے کے لیے کوشاں بھی رہیں۔ کسی لمحہ بھی اس کو خوش گواری سے برداشت کرنا شروع نہ کر دیں۔

۲۔ مصیبت ہو یا نعمت، یہ اللہ کی جانب سے آزمایش ہے، اور حیاتِ اُخروی میں فوز و فلاح کا ذریعہ۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کا معاملہ بھی خوب ہے۔ نعمت ملتی ہے تو شکر کرتا ہے، اور مصیبت پڑتی ہے تو صبر کرتا ہے۔ آپ اپنی بیروزگاری کو نہ اعمال کی پاداش سمجھیں، نہ نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیں۔ سعی ضروری ہے، اس لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہیں۔ اور جو نوشتۂ تقدیر ہے، اس سے صبر کی کیفیت حاصل کرتے رہیں۔

۳۔ پلاننگ اور کوشش بھی نوشتۂ تقدیر ہے۔ اسباب ظاہری کے استعمال سے ہی نتائج نکلتے ہیں، اِلاّ

ماشاء اللہ۔

کافی عرصہ سے یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے ذہنی اشکالات کو کسی کے سامنے رکھا جائے، اور ذہنی و قلبی اطمینان حاصل کیا جائے۔

جماعت کا رکن ہونے کے باوجود، اس وقت جماعت کا کام کرنے کو قطعاً بھی دل نہیں چاہ رہا۔ حالیہ شکست نے دل کو بُری طرح زخمی کیا۔ یہ زخم تو بھر جاتے، تنظیمی دراڑوں نے ارادوں میں مزید شگاف پیدا کر دیا ہے۔ رہی سہی کسر مقام اور حلقہ کی ست، مُردہ اور روایت پسند قیادت اور بوجھل تنظیم نکال دیتی ہے۔ لگتا ہے سارے جذبات سرد خانے کے نذر ہو گئے ہیں۔ ایک گہری مایوسی نے ہر چار جانب اپنا سایہ کیا ہوا ہے۔ ذہن میں سوالات گھومتے رہتے ہیں کہ کیا جماعت کی قیادت (ہر سطح کی) مقامی قیادت بن سکتی ہے؟ کیا جماعت پچاس سال کی جدوجہد کے بعد آگے کی طرف بڑھی ہے؟ کیا کام کے اس انداز کے ذریعے اسلامی انقلاب ہمارے ملک میں دستک دے سکے گا؟ مختلف دنیوی حاجات مثلاً روزگار، صحت اور تعلیم وغیرہ کے لیے قرآنی اور غیر قرآنی دعاؤں کا اہتمام کیا حیثیت رکھتا ہے۔ آیا یہ طرز حضور اکرمؐ اور صحابہؓ سے ثابت ہے؟

۱۔ مایوسی ایک زبردست وسوسہ ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے، وہ ہے اعتصام باللہ اور اللہ کی پناہ۔ دلائل کے انبار سے بھی وساوس کے تار و پود نہیں ٹوٹتے۔ رب الناس، ملک الناس، الہ الناس کی پناہ میں آتے ہی سارے وساوس کے تاریک سائے چھٹ جاتے ہیں، کہ وہ نور السمٰوٰت والارض ہے۔ وسوسہ کیا ہے؟ ایک خیال --- تحریک کا کام کیوں کروں، یہ دل میں اٹھنے والی سوچ ہے۔ جو سوالات آپ کے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا جواب ممکن ہے، لیکن ضروری نہیں کہ وہ جواب آپ کے لیے شافی ہو۔ جب دائیں بائیں، آگے پیچھے سے شیطان حملہ آور ہو رہا ہو، تو اس کے خلاف سب سے مضبوط دفاع اور سب سے کارگر حملہ، یادِ الٰہی ہے۔ آپ یہ سوچیں کہ کیا دعوت اِلی اللہ اور اقامت دین کے لیے جدوجہد، اللہ نے میرے اوپر فرض کی ہے؟ آپ کا دل مطمئن ہو، تو فرض کی ادائیگی میں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ قیادت کیسی ہے، وقت کتنا لگے گا۔

آپ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کیا پوچھے گا۔ کیا یہ کہ تمھاری قیادت مثالی کیوں نہ تھی؟ کیا یہ کہ ۵۰ سال میں بھی کامیابی کے آثار کیوں نمودار نہ ہوئے؟ یا یہ کہ جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو تم نے اپنے فرائض ادا کرنے میں کہاں تک لگایا؟

آپ کے سارے احساسات صحیح بھی ہوں، تو بھی آپ کے پاس اپنے رب کے لیے عذر ہونا

چاہیے کہ میں نے اپنی سی کوشش کر لی تھی۔ یہ جواب، اور اس کے صلہ میں جنت، اس کے علاوہ آپ کو اور کیا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان فطری طور پر ان چیزوں سے مایوس ہوتا ہے جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ لیکن اس مایوسی کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیے جانا ہی آپ کی اصل آزمایش ہے۔ امید نہ اپنے کام سے ہونا چاہیے، نہ حالات سے، بلکہ صرف اللہ سے۔ وہ چشم زدن میں حالات بدل سکتا ہے۔ اللہ کی رحمت سے جو مایوس ہوتا ہے وہ صحیح راہ سے بھٹک جاتا ہے۔

۲۔ ہم تو سرتاسر اللہ تعالیٰ کے آگے فقیر اور محتاج ہیں۔ دل کا ایک بار پھر دھڑکنا، اگلی سانس کا آنا، یہ سب اس کی مشیت پر منحصر ہے۔ توحید کی روح یہی ہے۔ اور اس لیے ہر چیز، دینی ہو یا دنیوی، صرف اللہ سے مانگنا چاہیے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جوتے کا تسمہ بھی اسی سے مانگو۔ صحت اور معاش تو بہت اہم چیزیں ہیں۔ حضورؐ نے بے شمار دعاؤں میں سب کچھ اللہ سے مانگنے کا طریقہ بھی سکھایا ہے، اور الفاظ بھی۔ امراض کے نام لے لے کر ان سے پناہ طلب کی ہے۔ شفا کی دعائیں تعلیم دی ہیں۔ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ (جب بیمار ہوتا ہوں، تو ہی شفا دیتا ہے) میں اسی کی تعلیم ہے۔ یہاں تک ثابت ہے کہ ایک صحابی نے بچھو کے کاٹنے پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دَم کر دیا، اور وہ اچھا ہو گیا۔ حضورؐ نے اس کی نہ صرف تصویب کی، بلکہ ہدیہ میں اپنا حصہ لگانے کو بھی فرمایا۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ،---- اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخَوْفِ وَالْحُزْنِ---- جیسی دعائیں اسی کے لیے تعلیم کی گئی ہیں۔

۱۔ اگر کسی علاقے میں سب ہی صاحبِ نصاب ہوں اور قربانی کریں تو گوشت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، کیا ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ چند لوگ قربانی کریں اور باقی افراد اس کی رقم کسی دینی، رفاہی یا جہادی فنڈ میں دیں۔

۲۔ اگر جہاد فنڈ میں قربانی کی کھال دینا جائز ہے تو پورے جانور کی رقم دینا کیوں جائز نہیں؟

۱۔ ہر واجب کی ادائیگی لازم ہے۔ جس پر قربانی واجب ہے اور وہ کر سکتا ہے، اس کو قربانی کرنا چاہیے۔ اصل مقصد حکمِ الٰہی کی تعمیل ہے، نہ کہ ہماری عقل کے مطابق گوشت کا مصرف۔ حج کے موقع پر قربانی لازم ہے، اور ظاہر ہے کہ وہاں بے پناہ گوشت ضائع ہوتا تھا، بلکہ ٹریکٹر ذبح کے بعد جانوروں کو مٹی میں دبا دیتے تھے۔ اب گوشت پیک کر کے دُور دراز مستحقین تک پہنچانے کا کچھ بندوبست ہو گیا ہے۔ ہماری بستیوں میں ایسی صورت حال کہ گوشت ضائع ہو جائے، قرینِ قیاس نہیں۔ ہر بستی میں غربا کی کثرت ہے، دوسری بستیاں بھی قریب قریب ہوتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ فرضی صورت حال ہے جو قربانی کی رقم رفاہی، دینی یا جہادی مقصد کے لیے دینے کا جواز تلاش کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے۔ اور

روزانہ نہ معلوم کتنے اخراجات ہوتے ہیں جو واقعی اسراف و تبذیر یا غیرلازمی اخراجات کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان سب سے رقم بچا کر ان مقاصد کے لیے کیوں نہ دی جائے، نہ کہ اللہ کے ایک حکم کو ترک کر کے دینے کا سوچا جائے۔

۲۔ ایک واجب دوسرے واجب کی جگہ نہیں لے سکتا، اِلّا یہ کہ ایک واجب کی ادائیگی سے دوسرا واجب ساقط ہوتا ہو۔ یہ افضلیت کا مسئلہ نہیں۔ اگر قربانی کرنے سے کوئی زیادہ بڑا فرض ساقط ہوتا ہو، تو آدمی قربانی چھوڑ کر وہ فرض ادا کرے گا۔ اگر اس طرح عمومی مقاصد کے لیے مخصوص واجبات ترک کیے جانے لگے تو کوئی واجب قائم نہ رہے گا۔ قربانی کی کھال سے پوری قربانی کا موازنہ صحیح نہیں ہے۔ قربانی کی کھال تو صدقہ ہے، اس کے دینے ہی کا حکم ہے۔ جبکہ قربانی کا گوشت آپ خود کھا سکتے ہیں، اقربا و احباب کو کھلا سکتے ہیں۔ ان کو آپ کھال نہیں دے سکتے۔ یہ قیاس مع الفارق ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

میں سید علی گیلانی کی کتاب رُودادِ قفس کے نسخے چند اہم روابط کو دینا چاہتا ہوں، آیا زکوٰۃ یا صدقہ کی رقم اس میں خرچ کی جا سکتی ہے؟

میری رائے میں یہ خرچ فی سبیل اللہ کی تعریف میں آتا ہے، بلکہ اس کے نتیجے میں اگر جہاد کے لیے رقم وصول ہو تو اس میں سے بھی یہ اخراجات دیے جا سکتے ہیں۔

ایک ساتھی بنک کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ انھیں رکن بنانا چاہا تو ساتھیوں نے توجہ دلائی کہ چونکہ وہ بنک سے پنشن لیتے ہیں اس لیے انھیں رکن نہیں بنایا جا سکتا۔ جماعتی پالیسی سے آگاہ فرمایئے۔

جہاں تک بنک سے ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن لینے کا تعلق ہے تو اس کا ایک پہلو فقہی ہے، جو آپ کسی معتمد علیہ مفتی سے پوچھ لیں، میرے علم کی حد تک ساری ہی پنشنوں میں بالعموم سود کا روپیہ غالب ہوتا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بنک کا ملازم سودی کاروبار میں ملوث نہیں۔ یہی اس کا ذریعہ معاش ہے، اور اب وہ اسے ترک کر کے کوئی متبادل ذریعہ معاش اختیار نہیں کر سکتا۔ پھر فقر کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ میرے خیال میں جماعت کے کسی ادارہ نے ان جزئیات میں کوئی پالیسی نہیں بنائی ہے۔ میری رائے میں تہذیبی بلوۂ عام میں یہ اضطرار کی صورت ہے، اس کو رکنیت میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ آخر ہم کب تک ایک جاہلی نظام کے غلبہ کے تحت مجبور افراد کی قوتیں اس نظام کو بدلنے کے لیے، حاصل کرنے سے اجتناب کرتے رہیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آپ یہ کوشش کیوں نہیں کرتے کہ بزورِ شمشیر حکومت بُرے لوگوں سے چھین کر نیک لوگوں کے حوالے کر دیں۔ یا عوام کو ڈنڈے کے زور سے ٹھیک کر دیں۔

۱۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس آزمایش کے لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے ارادہ سے صحیح راہ اختیار کرے۔ اس لیے ڈنڈے سے سمجھانے کا فلسفہ دین میں کوئی مقام نہیں رکھتا۔ ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہدایت خلق کے لیے انبیا و رُسل نہیں، جنرل اور فیلڈ مارشل مبعوث کرتا۔

۲۔ شمشیر کے ذریعہ انقلاب لانے کے لیے کچھ شرعی شرائط ہیں۔ جب تک وہ پوری نہ ہوں، اس کے استعمال کی گنجایش نہیں۔ مقصد ایک فاسد نظام کو نظامِ حق سے بدلنا ہے نہ کہ فساد میں اضافہ اور خون ریزی۔

شمشیر کون چلائے گا، اور چلانے والوں کا حامی و مددگار کون ہو گا؟ وہی عوام جو آپ کی رائے میں خود اپنی اصلاح کے لیے ڈنڈے کے محتاج ہیں؟

۱۔ جماعت اسلامی الیکشن میں حصہ لیتی ہے، اس طریقِ کار کے حق میں آپ کیا دلائل دیں گے۔ دوسرے طریقے جیسا کہ ڈاکٹر اسرار احمد پیش کرتے ہیں، ان پر آپ کا کیا تجزیہ ہے۔

۲۔ الیکشن پر لگنے والی رقم دعوتی کام اور لٹریچر کی تقسیم پر لگائی جائے تو کیا بہتر نہ ہو گا۔

۳۔ مولانا مودودیؒ نے کہا تھا کہ پنچایتی نظام جب تک نہ ہو گا۔ الیکشن سے فائدہ نہ ہو گا۔ کیا یہ نظام اب ہے جو جماعت الیکشن میں حصہ لیتی ہے۔

۴۔ جماعت کبھی سیکولر جماعتوں سے اتحاد کر لیتی ہے، اور کبھی نہیں کرتی۔ کبھی عورت (فاطمہ جناح) کا ساتھ دیتی ہے، کبھی اس کی حکمرانی کا عدم جواز پیش کرتی ہے۔ سیاسی روش میں یکسانیت نہیں پائی جاتی؟

۵۔ جماعت کا دعوتی پہلو کمزور محسوس ہوتا ہے، دعوت پہنچانے کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔

۱۔ الیکشن میں حصہ لینا مستقل طریقِ کار نہیں، ایک تدبیر اور حکمتِ عملی ہے۔ طریقِ کار تو ایک ہی ہے، جس کی طرف قرآن مجید نے رہنمائی فرمائی ہے اور جسے انبیا کا طریقِ کار کہا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ انسانوں کو بدلا جائے۔ اور انسانوں کو مجتمع کر کے، ان کو قوت بنا کے، ان کے ذریعے زمامِ کار، نظام اور معاشرہ کو بدلا جائے، تاکہ اللہ کا کلمہ غالب ہو اور اس کا دین قائم ہو۔ دعوت و تبلیغ کے طریقے و تدابیر اور حکمتِ عملی کی صورتیں حالات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں، اور زمامِ کار اور نظام بدلنے کی تدابیر و حکمت عملی بھی۔ میرا خیال ہے کہ اس بنیاد پر سب کو اتفاق ہو گا، خواہ کوئی انتخابات میں

حصہ لینے کے حق میں ہو یا خلاف۔

زمامِ کار کی تبدیلی کے لیے جو تدبیر اور حکمتِ عملی بھی اختیار کی جائے اس کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اس کو منع نہ کیا ہو۔ دوسری یہ کہ اس سے حصولِ مقصد ممکن نظر آتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ ہی سے، جن کے ہاتھ میں زمامِ کار ہے وہ خود بدل جائیں۔۔۔ مثلاً، جیسا مدینہ کے انصار کے معاملہ میں ہوا، یا نبی کریمؐ کے خطوط کے نتیجے میں۔ ہو سکتا ہے کہ معاشرہ کی اتنی بڑی تعداد بدل جائے کہ زمامِ کار جن کے ہاتھ میں ہو، وہ انھیں چھوڑتے ہی بنے۔ ممکن ہے ان کے ساتھ پُرامن کشمکش ہو، مسلح جدوجہد ہو، باہر سے جنگ آ جائے، لوگ سڑکوں پر نکل آئیں۔ لوگ سول مزاحمت کریں، وہ ہتھیار سنبھال لیں، یا ممکن ہے وہ بیلٹ بکس میں ووٹ ڈال کر تبدیلی لے آئیں۔ بالآخر تدبیر اور حکمتِ عملی (Stretegy) کیا ہوگی، اس کا انحصار حالات پر ہے۔

اس لحاظ سے اگر آج کے معاشرہ میں انتخابات کے ذریعہ تبدیلی آیا کرتی ہو، تو اس تدبیر کو اختیار کرنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی قباحت نہیں، بلکہ اس پر کوئی اصولی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ بے شک انتخابات کے طریقے میں خرابیاں ہیں اور خرابیاں پیدا ہونے کا امکان ہے، لیکن ایسی خرابیاں اسی درجہ میں پرامن مزاحمت یا مسلح جدوجہد میں بھی پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ خرابیاں تدابیر سے زیادہ انسانوں میں ہوتی ہیں۔ بادشاہ، جہاد فی سبیل اللہ کو لوٹ مار اور اپنی بادشاہی کے قیام کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے جہاد کا طریقہ غلط نہیں ہو جائے گا۔

جو لوگ انتخابات کو فی نفسہٖ غلط طریقہ قرار دے رہے ہیں، وہ اگر کبھی اس قابل ہو جائیں کہ معاشرہ ان کے ساتھ ہو اور وہ اس طریقہ سے پُرامن تبدیلی لا سکیں، تو کیا وہ اس طریقہ کو استعمال نہیں کریں گے؟ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ جب کوئی دعوت، پارٹی، یا شخصیت قبولیت عامہ حاصل کر لیتی ہے تو دھن، دولت، جاگیرداری سب دھرے رہ جاتے ہیں، اور عوام الناس اپنی پسند کے نمایندے منتخب کر لیتے ہیں۔ انتخابات میں فتح صرف دھن و دولت پر منحصر نہیں۔ آخر ایک سیٹ پر بے تحاشا دولت خرچ کرنے والے، جاگیردار اور سرمایہ دار ایک سے زیادہ ہوتے ہیں، اور ایک کے علاوہ سب ہارتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اپنی دعوت و تبلیغ سے قبولیت عامہ حاصل کرنے میں ناکامی کا الزام ہم انتخابات کے طریقۂ کار کے سر منڈھ کر خود کو بری الذمہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کچھ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا، والا معاملہ ہے۔ انتخاب ایک ذریعہ (tool) ہے، نااہل کاریگر اپنے اوزاروں ہی سے لڑتا رہتا ہے۔

۲۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے وسائل خرچ کرتے ہوئے ہم بہتر نتائج کا حصول پیشِ نظر رکھیں، اور

متبادل مصارف میں سے وہ مصرف اختیار کریں جس سے زیادہ نفع کی امید ہو۔ لیکن انتخاب بھی ایک دعوتی عمل ہے۔ اس قسم کے سماجی کاموں میں، وہ انتخاب ہو یا تقسیم لٹریچر، نفع کو ناپنا اتنا آسان نہیں کہ یہ کہہ دیا جائے کہ یہی وسائل اگر تقسیم لٹریچر پر لگا دیے جاتے تو زیادہ کارگر ہوتے۔ ہو سکتا ہے کہ لاکھوں روپے کا لٹریچر تقسیم ہو، اور کوئی قائل نہ ہو، ساڑھے نو سو سال دعوت کا کام ہو اور تھوڑے لوگ ایمان لائیں۔ اس میدان میں ناپنے تولنے کے پیمانے کچھ اور ہی ہیں۔

۳۔ پنچایتی نظام تو جماعت کا اپنا وضع کردہ طریقِ کار تھا، اپنے نمایندے منتخب کرنے کا۔ یہ الیکشن کے نظام کا حصہ نہ اس وقت تھا، نہ اب ہے۔ اس میں فوائد بھی ہیں، اور نقصان بھی۔ اب جماعت کا اپنا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے سارے کارکنوں سے رائے لیتی ہے (جو ایک محدود پیمانہ پر پنچایت ہی ہے) اور آخری فیصلہ مرکزی پارلیمانی بورڈ کرتا ہے۔

۴۔۔ آپ دو چیزوں کا فرق ملحوظ رکھیں تو آپ کی سمجھ میں یہ بات آ سکے گی کہ جماعت کے مختلف اقدامات اور فیصلوں میں فرق کسی تضاد یا عدم یکسانیت کا نتیجہ نہیں۔ ایک ہیں اصول، مستقل طریق کار اور پالیسی، دوسرے ہیں اسکے عملی انطباق کے لیے تدابیر اور صورتیں۔ دوسری چیز کا انحصار کلیتاً، حالات، اور مصالح پر ہو گا۔ کبھی صلح کی جا سکتی ہے کبھی جنگ، کبھی سزا دی جا سکتی ہے کبھی معافی، کبھی اتحاد ہو سکتا ہے کبھی صف آرائی --- بدر کے میدان میں سردارانِ قریش کو تہ تیغ کیا گیا، اور خون ریزی کے بغیر قیدی بنانے کو بھی پسند نہیں کیا گیا۔ پھر صلح حدیبیہ ہوئی، فتح مکہ کے موقع پر عفوِ عام کا اعلان ہوا، اور برسوں کے جانی دشمنوں کو داد و دہش سے نوازا گیا۔ یہودیوں کو پہلے ایک ملّت کا حصہ بنایا گیا، پھر کسی کو جلاوطن کیا گیا اور کسی کو قتل، پھر خیبر میں ان کی کمر توڑ کر رکھ دی گئی، پھر ان کو جزیرہ العرب سے باہر نکال دیا گیا۔ سیاست اور جنگ میں یہ نہیں ہو سکتا، کہ جس سے دشمنی ہو اس سے ہمیشہ دشمنی رہے، جو ایک دفعہ حلیف بن جائے پھر وہ کبھی حریف نہ بنے۔ جماعت کے سارے فیصلے تدبیر و حکمتِ عملی کے دائرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بارہ میں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ وہ بحیثیت تدبیر صحیح نہ تھے، لیکن وہ کسی تناقض کا مظہر نہیں۔

۵۔ دعوت کا کام ایسا کام ہے جس کے بارہ میں کبھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس پیمانہ پر ہو رہا ہے کہ اس کا حق ادا ہو رہا ہے۔ اس لیے دعوت کے کام میں کوتاہی اور کمی کا احساس ہمیں روزِ اوّل سے رہا ہے۔ پھر ایک کوتاہی تو اس لحاظ سے ہوتی ہے کہ ہم آئیڈیل سے کتنے دُور ہیں۔ اس لحاظ سے ہم ہمیشہ ہی پیچھے رہیں گے۔ ایک کوتاہی اس لحاظ سے کہ عملاً جو کچھ کر سکتے ہیں وہ نہیں کر رہے۔ ہم خود اس لحاظ سے بھی ہمیشہ اپنی کوتاہی کے معترف رہے ہیں۔ لیکن آج کل، مجھے اس بات کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں،

کہ ہماری تعداد میں جتنا اضافہ ہو گیا ہے اس کے لحاظ سے ہمارا دعوت کا کام بہت کم اور کمزور ہے۔ اضافہ کے لیے جو تدابیر بس میں ہیں، وہ اختیار کر رہے ہیں۔ آپ تعاون بھی کریں، اور دعا بھی۔ جماعت کوئی مجرد وجود نہیں۔ ہمارا، آپ کا نام جماعت ہے۔ ہمارا آپ کا دعوتی کام مضبوط ہو گا تو جماعت کا دعوتی کام خود بخود مضبوط ہو ہو گا۔

نماز اور قربانی کی حوالے سے مولانا حمید الدین فراہیؒ کا مضمون (مئی ۹۴) پڑھ کر قربانی کے بارے میں چند سوالات ذہن میں ابھرے ہیں: مضمون میں کہا گیا ہے کہ "نماز میں زبان اور اداؤں کے ذریعہ سے ایمان کا اقرار کیا جاتا ہے۔ اور قربانی میں اسی ایمان کی تصدیق جان دے کر کی جاتی ہے"

۱۔ کیا ہم ابھی تک اقرار پر ہی گزارا کر رہے ہیں۔ جان کی قربانی کا وقت کب آئے گا، یعنی ہم اپنے ایمان کی تصدیق کب کریں گے؟۔

۲۔ کیا پاکستان کے مسلمانوں پر کشمیر کے مسئلے پر اب بھی جہاد (قتال) فرض نہیں ہوا؟ اسی طرح کشمیر، بوسنیا وغیرہ کے حوالے سے آپ کے پاس کیا پروگرام ہے؟۔ براہِ کرم رہنمائی فرمایئے کہ میں کیا کروں۔

۱۔ جان اسی وقت دی جائے گی جب جان طلب کی جائے۔ ہزارہا صحابہ کے لیے یہ موقع نہیں آیا، لیکن وہ اپنے ایمان میں صادق تھے۔ جب تک وہ موقع نہیں آتا، اس وقت تک ہر وقت جان دینے کے لیے آمادگی اور آرزو ضروری ہے۔ اس کی علامت قربانی ہے۔ پھر اللہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے تو ہزار بار اپنی خواہشات، پسند ناپسند اور مرغوبات کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ یہ بھی قربانی ہے، اور اپنے ایمان کی تصدیق کے زمرہ میں آتا ہے۔ یہ سوءِ فہم ہو گا اگر کوئی یہ سمجھے کہ ہر شخص جب تک جان نہیں دے گا اس کے ایمان کی تصدیق نہ ہو گی۔

۲۔ قتال کے لیے چند شرائط ہیں۔ جب وہ شرائط پوری ہو جائیں تو ہر شخص پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ پھر بھی سب میدان جنگ میں جا کر قتال نہیں کرتے۔ فی زمانہ تو اگر ایک آدمی میدان جنگ میں لڑتا ہے، تو اس کے پیچھے سو آدمی درکار ہوتے ہیں، جو اس کا لڑنا ممکن بناتے ہیں۔

اس وقت کشمیر اور بوسنیا سے باہر جو جماعتیں وہاں کے جہاد کے بارہ میں مخلص ہیں، ان کے لیے جہاد میں شرکت کا راستہ یہی ہے کہ وہ وہاں کے مجاہدین کو ہر طرح کی مادی، مالی، اخلاقی اور سیاسی مدد پہنچائیں۔ اور وہاں کے کمانڈر جس حد تک نفری کے طلب گار ہوں اس حد تک وہ بھی پہنچائیں۔

(خرم مراد)